اردو ادب اس سہ ماہی میں

از

(خواجہ احمد فاروقی ایم۔ اے صدر شعبۂ اردو دہلی کالج)

(یہ تقریر ۲۰ رجون ۱۹۵۱ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر کی گئی تھی جس کو آل انڈیا ریڈیو کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے)

اُردو ادب کی اس سہ ماہی میں چند ایسی کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ جن سے اُردو کے خوش آئند مستقبل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادیب شاعر۔ نقاد اور مورّخ راستہ کی دشواری اور اپنی آبلہ پائی پر مسکراتے ہوئے منزلِ مقصود کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

منظومات میں دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک غلام ربانی تاباںؔ کی "سازِ لرزاں" اور دوسری بیج لال رعناؔ کی "رعنائیاں"۔ غلام ربانی تاباںؔ کی شاعری گلستاں اور شبستاں کی منزل سے گذر کر فکر اور عمل کی منزل پر پہنچ گئی ہے۔ ان کی شاعری میں یہ نیا موڑ ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوا ہے۔ جب بقول اُن کے انھوں نے تلخابِ اذیت کو پیا اور کانٹوں نے بہاروں کا حسن توڑ دیا۔

اور سوتے ہوئے احساس کی بیداری نے رامش و رنگ کا پندارِ زبوں توڑ دیا

شروع میں اُن کی شاعری کا رنگ وہی تھا۔ شبستانی گئی۔ غزل خوانی گئی۔ گلفشانی گئی لیکن اس وقت بھی اُن کے رومان میں تھوڑا سا جنون باقی تھا۔ میرا مطلب یہ ہے۔ کہ اُن کے رومانی نظریے ریاضؔ اور نوحؔ سے بالکل مختلف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق رسمی شاعری سے کبھی نہیں رہا۔ اس لئے کہ ان کی محبت کا نقطۂ نظر اور ان کی شاعری کا وجدان روایتی شاعروں سے مختلف ہے ان کی وہ شاعری جس میں جذبہ سے زیادہ فکر کا عنصر شامل ہے۔ سب سے زیادہ اہم ہے اس میں دھیما دھیما نغمہ ہے۔ ہلکا ہلکا درد ہے۔ ماحول کی عکاسی ہے ان کی وسعتِ نظر۔ وحدتِ فکر

اور پختگیِ مذاق سے امید ہے۔ کہ ان کا شاعرانہ مقام حال ہی میں نہیں مستقبل میں بھی بلند ہوگا۔

اس سہ ماہی کی ایک اور اہم کتاب برج لال رعناؔ کی "رعنائیاں" ہے اس پر علامہ کیفیؔ نے دیباچہ لکھا ہے۔ اور تعارف پروفیسر محرومؔ نے۔ اگر یہ تعارفی چیزیں نہ ہوتیں۔ تب بھی رعناؔ کی شاعری کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہوتی۔ ان کی شاعری میں درحقیقت اتنی رعنائیاں موجود ہیں۔ کہ اس قبائے گل کے لئے گل بوٹے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ رباعیاں لکھتے ہیں۔ جو شاعری میں سب سے مشکل صنف ہے اور وہ اس وقت تک نہیں لکھی جا سکتیں کہ جب تک نظر میں گہرائی۔ مطالعہ میں وسعت اور مذاق میں پختگی نہ ہو۔ ان کی رباعیوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے نئے تقاضوں سے ناواقف نہیں ہیں اور ان کا ہاتھ کائنات کی نبض پر ہے۔ ان کا ذہن سلجھا ہوا ہے۔ ان کی طرزِ بیان میں بھی ابہام اور تشکیک نہیں ہے۔ انھوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور نظمیں بھی۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان کی طبیعت رباعیوں کے لئے زیادہ موزوں ہے۔

اردو شاعری میں "رباعی" شروع ہی سے پائی جاتی ہے۔ دکن میں بھی اس کی طرف سے غفلت نہیں برتی گئی۔ شعرائے دہلی اور لکھنؤ نے غزلیات اور قصائد کے ساتھ رباعیات بھی کہیں۔ لیکن غدر تک ان کی طرف توجہ محض ضمنی طور پر تھی۔ انیسؔ اور دبیرؔ اور شعرائے مرثیہ نے بھی رباعی کو بڑا فروغ بخشا اور اس میں مضامین اور خیالات کا قابل قدر اضافہ کیا۔ اس کے بعد حالیؔ اور اکبرؔ نے اس سے تبلیغی اور اصلاحی کام لیا۔ عصر حاضر میں اس صنف میں جتنی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کی نظیر رباعی کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

رعناؔ کی رباعیاں زندگی کے اعلیٰ ترین رخ کو پیش کرتی ہیں۔ اور بلحاظِ ادب اظہار خیال کا کامیاب نمونہ ہے۔

فسانوں میں دو کتابوں کا تعارف ضروری ہے۔ ایک ویشؔ کی "بیگم" اور "دو ... ت کی میراث"

ویش صاحب کی تحریر میں ہلکا ہلکا سا طنز ہے۔ شوخی اور بے تکلفی ہے۔ چھوٹے چھوٹے

جملوں میں وہ ایسے ایسے نکات پیش کر دیتے ہیں۔ جو صفحوں میں نہیں سما سکتے۔ ان میں انجیل کی سی پہیلیوں کا لطف ہے وہ مضمون اور افسانہ لکھتے نہیں، بنتے ہیں یہ نازک کاری ان کے اکثر مضامین میں نظر آتی ہے۔ ان کے وہ ہلکے پھلکے مضامین جو ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں۔ شگفتگی اور دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ان کے افسانوں میں ندرت ہے۔ مقصد ہے اور حقیقت نگاری ہے لیکن بعض جگہ وہ نذیر احمد کی طرح نصیحت کرنے لگتے ہیں جو اُن کے لئے مناسب نہیں۔

اُن کے افسانہ "بیگم" کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے۔ انھوں نے ہندوستانی بیوی کے کردار کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ لیکن اگر اس کا آخری پیراگراف نکال دیا جاتا۔ تو افسانہ اور بھی بلند ہو جاتا۔ یہ پیراگراف اس طرح شروع ہوتا ہے۔

"یہ ہے معیار "ہندوستانی عورتوں کا" "یہ ہے قانونِ مشرق" جس کے بارے میں اقبال نے کچھ لکھا ہے۔ مگر پھر بھی کم ہے" کیا کسی اور ملک کی عورت سے یہ امید کر سکتے ہیں"؛ یہ پیراگراف غیر ضروری ہے اور فنی نقطۂ نظر سے غیر موزوں۔ پرکاش پنڈت کے افسانوں میں سماجی مسائل ہیں نفسیات کی گتھیاں اور ذہنی پیچیدگیاں ہیں۔ جن کو انھوں نے پوری چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ ایسی حقیقت نگاری جس کی تمام تر بنیاد نفسیات پر ہو۔ بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن پرکاش نے دل کے نہاں خانوں میں اُتر کر ایک ایک جذبہ کو پوری راست بازی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ نفسیاتی معاملات اتنے نازک ہیں کہ ان کو ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔ لیکن پرکاش نے اپنے لہو سے ان میں ابدیت کا رس بھر دیا ہے۔

ان کا افسانہ "گرداب" اس قابل ہے کہ اسے دوسری زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ ان کے بعض افسانوں میں غزل کی سی داخلیت ہے۔ لیکن جہاں اس میں خارجیت شامل ہو گئی ہے۔ وہاں یہ طاؤس و رباب۔ شمشیر و سناں میں تبدیل ہو گیا ہے۔ پرکاش کی زبان ابھی خیالات کی باریکیوں کا ساتھ نہیں دیتی۔ وہ معیاری نہیں ہے اور ابھی اسے قطرہ سے گہر بننا ہے۔

اردو میں ایک نیا رجحان یہ ہے کہ ماضی کے حالات اور مشاہیر پر دوبارہ نظر ڈالی جائے اور ان کے کارناموں کو اُجاگر کیا جائے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی کتاب "شاہ ولی اللہؒ" دہلوی کے

سیاسی مکتوبات اسی قسم کی ایک کوشش ہے۔ شاہ ولی اللہؒ اٹھارھویں صدی کے سب سے ممتاز عالم اور صوفی تھے۔ اور وہ بقول رتن لال منسل کے "بدیشی قوموں کے بڑھتے ہوئے خوفناک پنجوں سے ہندوستان کو بچانے کے لئے زندگی بھر لڑتے رہے۔ اور اپنے وارثوں۔ بیٹوں اور ہزاروں شاگردوں کے دل میں ایسی آگ چھوڑ گئے۔ کہ انھوں نے مرجانا پسند کیا۔ لیکن غلامی کو برداشت نہیں کیا۔"

نظامی صاحب نے شاہ صاحب کے سیاسی مکتوبات جو تاریخی معلومات کا گنجینہ ہیں۔ اُردو ترجمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ ان خطوں سے مغلوں کے زوال۔ معاشرت کی خرابیوں اور ملک کے اقتصادی بحران پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے نظامی صاحب کی یہ فاضلانہ کوشش ہر طرح قابل ستائش ہے۔ انھوں نے ان خطوں کے ایڈٹ کرنے میں جو محنت، تحقیق اور تلاش کی ہے وہ بھی قدر اول کی چیز ہے۔

پروفیسر محمد حبیب نے لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے۔ کہ کامل غیر جانب داری اور ناقدانہ تحقیق ان کی علمی کاوشوں کی امتیازی خصوصیات ہیں یہ انداز تلاش و تحقیق ان کی اس تالیف میں بھی موجود ہے۔

تنقیدی کتابوں میں اختر اورینوی کی دو کتابیں "تنقید و تحقیق" اور "تنقید جدید" قابل ذکر ہیں ان کے بعض مضامین اصولی و نظریاتی ہیں۔ اور بعض ایسے ہیں۔ جن میں ادب کے مختلف گوشوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ لیکن ان میں جمالیاتی رنگ نمایاں نہیں۔ یعنی ان کی تنقید آہ اور واہ کے دائرے سے نکل کر سائنس اور اصول کی دنیا میں پروان چڑھی ہے وہ تشریح کرتے ہیں۔ لیکن حکم نہیں لگاتے وہ اچھی بری چیز سے متاثر ہوتے ہیں لیکن اس کی مخالفت یا نفرت میں کھو نہیں جاتے۔ بعض بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب کے جانچنے کے اصول کو اس کی تصنیف میں ڈھونڈتے ہیں مگر روایتی اور اصولی نہیں ہے کہ ایک فیتے سے وہ سب کو ناپتے چلے جائیں۔ وہ ذریعہ جانچتے ہیں اور اپنے احساس اور ادراک کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ عکاسی ۔ ممکن نہیں ہے جب تک نگاہ میں کون و مکان کے جلوے نہ ہوں اور افادیت اور جمالیت دونوں نقطہ ہائے نظر کا احترام نہ ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ اختر صاحب کی تنقیدوں میں

یہ توازن اور وسعتِ نظر موجود ہے۔ وہ فرد اور جماعت اور ادب اور زندگی کے رشتے سے واقف ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ جماعتی نظام پر بھی ان کی نظر ہے۔ اختر صاحب کی ہر رائے سے اتفاق ممکن نہیں ہے۔ لیکن ان کی منزل صحیح ہے "بولیوں کے سنگم میں" انھوں نے لکھا ہے "کہ اردو خالص آریائی زبان نہیں ہے" بلکہ اس کی تعمیر اور تشکیل میں دراوڑی زبانوں کو بھی دخل ہے۔ یہ بات بالکل نئی ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لئے آریائی زبانوں کے علاوہ دراوڑی زبانوں کی بھی واقفیت ضروری ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اختر صاحب نے اس قسم کی شہادتیں اور دلیلیں فراہم نہیں کیں جن سے یہ نکتہ ذہن نشین ہو جاتا۔

اردو میں تنقید کی اہمیت دن بدن بڑھتی جارہی ہے اور بہت سے نوجوان بھی اس میدان میں سرگرم ہیں اسی قسم کا ایک مجموعہ "پرکھ" کے نام سے غلام سرور صاحب کا پٹنہ سے شائع ہوا ہے۔ اس میں چھ مضامین ہیں (۱) تاریخ ادب اردو (۲) شہنشاہ حبشہ (۳) اردو صحافت (۴) اقبال کی غزلیں (۵) ترقی پسند تحریک اور (۶) مواد اور ہیئت۔

شروع میں آل احمد سرور کا مقدمہ اور جناب اختر اورینوی کا لکھا ہوا تعارف ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ غلام سرور صاحب ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ان کا تنقیدی شعور بہت متوازن ہے۔ تاریخ ادب اردو والے مضمون میں انھوں نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر سکسینہ نے بہار کی ادبی خدمات کا اعتراف نہیں کیا۔ یہ واقعی ان سے بہت بڑی بھول ہوئی، اردو ادب کی کوئی تاریخ بغیر صوبہ بہار کے ذکر کے مکمل نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ غلطی دوسرے مورخین ادب نے بھی کی ہے اس لئے غلام سرور صاحب کو طنز اور غصہ سے کام نہیں لینا چاہئے تھا۔ یوں بھی سنجیدہ اور علمی بحث میں جذبات کو دخل نہیں ہونا چاہئے۔

ان کا مضمون "اردو صحافت" بہت دلچسپ ہے انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان کے تقریباً تمام محققین اس بات پر متفق نظر آتے ہیں۔ کہ اردو کا پہلا اخبار "اردو اخبار" ہے جسے مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے ۱۸۳۷ء میں دلی سے نکالا۔ مولانا محمد حسین آزاد خود لکھتے

ہیں۔ "۱۸۳۶ء میں اردو کا اخبار دہلی میں جاری ہوا۔ یہ اس زبان میں پہلا اخبار تھا۔ کہ میرے والد مرحوم کے قلم سے نکلا"۔ علامہ یوسف علی بھی اُردو اخبار ہی کو اردو کا پہلا اخبار مانتے ہیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے خیال میں اردو اخبار "اردو کا پہلا اخبار" ہے جو ۱۸۳۶ء میں دلی سے نکلا اور ۱۸۵۷ء تک خوب چلتا رہا ہاں ۱۸۲۲ء میں فارسی کے پہلے اخبار "جام جہاں نما" کا اُردو ضمیمہ بھی شائع ہونے لگا۔ مگر اسے قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔

سید ابو عاصم لکھتے ہیں "اردو اخبار" ۱۸۳۶ء میں نکلا اور صحافت میں اولیت کا فخر اسی کو حاصل ہے اور ۱۸۵۷ء تک یہ خوب چلتا رہا۔

اس سلسلہ میں میرا ذاتی خیال یہ ہے۔ کہ "جام جہاں نما" کو اُردو کا پہلا اخبار سمجھنا چاہئے۔ یہ ۱۸۲۳ء میں جاری ہوا تھا اور اُردو فارسی دونوں میں شائع ہوتا تھا۔ اس کے پرچے ہمارے ARCHIVES NATIONAL میں موجود ہیں۔ اس میں اردو کا حصہ فارسی اخبار کا ضمیمہ نہیں تھا۔ حسن اتفاق سے "جام جہاں نما" کے مالک ہری ہردت کی عرضی رکارڈ میں موجود ہے جس میں انھوں نے اپنے فارسی اور ہندوستانی اخبار "جام جہاں نما" کے جاری کرنے کی اجازت مانگی ہے۔ اس عرضی میں پرنٹر کا نام WILLIAM HOPKINS PEARCE بتایا گیا ہے اور ایڈیٹر کا نام لالہ سدا سکھ جو منشی تھے ہری دت جی نے ایک اور عرضی سائمن فریزر کو بھیجی تھی۔ جس میں کم قیمت کے ٹکٹ لگانے کی اجازت چاہی تھی۔ اس میں بھی انھوں نے اپنے آپ کو فارسی اور اُردو کے اخبار۔ "جام جہاں نما" کا مالک لکھا ہے۔

ترقی پسند تحریک" پر غلام سرور کا مضمون بہت دلچسپ اور مؤثر ہے۔ ان کے مضامین میں کاوش فکر و نظر موجود ہے۔

در زندگی۔ فرد اور جماعت کے تعلق سے واقف ہیں۔ لیکن گروہ بندی کے قائل نہیں انسانیت کے مقامات سے آگاہ ہیں۔ ان میں خلوص۔ ہمت اور ایمانداری ہے۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ اردو کے نقادوں میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیں گے۔

اردو ادب کے اس جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے ادیب، شاعر۔ نقاد۔ ذوق نظر

اور ذوقِ عمل دونوں رکھتے ہیں۔ لیکن ابھی ان کے آرٹ نے ازلی اور ابدی حقائق کا احاطہ نہیں کیا ہے اس میں آفاقیت کا رنگ بھرتا ہے۔

یہ کام بغیر تیز نگاہی۔ سائنسی نقطۂ نظر۔ بلند نفسی۔ اور گہری معلومات کے ممکن نہیں ہے۔ تھوڑی بہت معلومات آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سے صرف نمائش کا کام لیا جا سکتا ہے، اب ضرورت ہے۔ ٹھوس لیاقت۔ اور صحیح بصیرت کی۔ ہمارے سامنے ایک وسیع میدان ہے۔ اس کی وسعتوں کو سمیٹنا ہے۔ بہت سے تاریک گوشوں کو روشنی میں لانا ہے۔ یہ کام رسالہ معاصر پٹنہ اور اردو ادب علی گڈھ انجام دے رہے ہیں جو حال میں دوبارہ نکلنے شروع ہوئے ہیں اور ان سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، لیکن اس کام کی بنیاد اسی وقت مضبوط ہو سکتی ہے جب پورا اردو داں طبقہ اس میں عملی دلچسپی لے۔

دارالعلوم دیوبند کا علمی، دینی، اصلاحی ماہنامہ

"دارالعلوم"

یہ مرکز علمی "دارالعلوم" کا ماہانہ رسالہ ہے جو بڑی محنت، مستعدی اور پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، حضرات اکابر و اساتذہ دارالعلوم کے علاوہ ملک کے ذمہ دار اہلِ قلم اپنے تازہ مضامین رسالہ ہذا کو عنایت فرماتے ہیں، دارالعلوم کے ہر پرچہ میں آپ دینی مقالات اصلاحی مضامین، عصرِ جدید کے ممتاز شعراء کا دینی اور معیاری کلام، مطبوعات پر منصفانہ تنقید، دارالعلوم کے تازہ حالات اور اس کی علمی اور اصلاحی سرگرمیوں کی صحیح روداد ملاحظہ فرما سکتے ہیں رسالہ کی کتابت و طباعت اور کاغذ بہترین ہوتا ہے پاکستان کے خریدار منیجر صاحب رسالہ ندائے حرم ۱۴۲/۱۱ جمشید کوارٹر کراچی ۵ کو منی آرڈر سے سالانہ چندہ بھیجیں اور کوپن منی آرڈر پر انہیں ہدایت کریں کہ رسالہ دارالعلوم کا چندہ ہے ڈاکخانہ کی رسید ہمیں بھیج دیں رسالہ ان کے نام جاری کر دیا جائیگا۔ ہند و پاکستان سے سالانہ چندہ [illegible] افریقہ و برما اور دوسرے ممالک سے شلنگ نمونہ کے پرچہ کیلئے ۱۰ کے ٹکٹ بھیجئے بلا قیمت نمونہ بھیجنے سے معذوری ہے۔ سال بھر سے کم کے لئے رسالہ جاری نہیں ہوگا خط و کتابت و ترسیل زر کا پتہ:-

سید محمد ازہر شاہ قیصر ایڈیٹر رسالہ دارالعلوم، دارالعلوم دیوبند